روداد ابتلاء، احمد رائف مصری

جناب خلیل الحامدی صاحب

(۸)

ابو زعبل میں خفیہ پولیس نے تعذیب و تشدد کے جو وسائل و آلات شہر والوں کے خلاف استعمال کیے ہیں، وہ استبداد و تشدد کے لحاظ سے ان تمام وسائل سے فوقیت لے گئے ہیں جو رومیوں اور فارسیوں نے اپنے دور میں استعمال کیے ہیں۔ یا عیسائیوں نے مذہبی استبداد اور "تحقیقاتی عدالتوں" کے دور میں اختیار کیے ہیں۔ تاریخ کی کتابوں میں میں نے یہ باتیں پڑھی تھیں۔ لیکن میں نے ذاتی طور پر جو تجربہ حاصل کیا ہے وہ ان تمام باتوں سے سراسر مختلف ہے جو میں نے پڑھی ہیں۔ میرا تجربہ درندگی، انسانیت سوزی اور تشدد و تذلیل میں تاریخ کے تمام تجربات سے فوقیت لے گیا۔

ابھی گرفتاری کے پہلے ہی روز ایک فوجی افسر مجھ سے دلیل و منطق کے انداز میں بات کرتے ہوئے کہنے لگا: سنا ہے آپ تعلیم یافتہ، مطالعہ کے رسیا اور ہر دم تازہ معلومات سے بہرہ مند رہنے والے ہیں۔

راقم: امید ہے میری یہ خوبی آپ کے جذبۂ رحم کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔

افسر: جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں تو آپ کے ساتھ کوئی تعرض نہ کروں گا۔ خواہ کیسا ہی قوی اور ٹھوس ثبوت موجود ہو۔ میرے لیے کسی انسان کو مارنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن کیا آپ نے یورپ کی تحقیقاتی عدالتوں کے بارے میں کچھ پڑھ رکھا ہے؟

راقم: جی ہاں۔

افسر (انتہائی غم انگیز آواز کے ساتھ) یہاں آپ جس چیز کا مشاہدہ کرنے والے ہیں وہ شدت کے لحاظ سے ان تمام چیزوں سے بڑھ کر ہے جو آپ نے پڑھ رکھی ہیں۔

راقم: کیا میرے ساتھ ایسا سلوک کیا جانے والا ہے؟

افسر: آپ کو کیوں مستثنیٰ قرار دیں گے؟

راقم: کیا کوئی اپیل یا دلیل میرے کام نہ آئے گی؟

افسر: خود خدا بھی اب تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔

اس افسر نے سانپ کی پھنکار کے ساتھ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا: "یہ وہ جگہ ہے جہاں خدا بھی داخل نہیں ہوتا۔ اور نہ خدا اس کے بارے میں کوئی علم رکھتا ہے (معاذ اللہ)۔ میری یہ بات کہاں تک سچی ہے یہ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔"

راقم: پھر میں کیا کروں؟

افسر: بولتے رہو، اور جو کچھ جانتے ہو بتاتے جاؤ۔ ہر چیز بیان کر ڈالو۔ یعنی سازش کیا تھی اور سازشیوں کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا۔

راقم: لیکن سازش وغیرہ کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

افسر: یہ بیکار بات ہے۔ تمہیں جاننا چاہیے کہ سازش ہوئی ہے۔

الغرض جو شخص بھی اس جگہ داخل ہو جاتا تھا ——— جہاں معاذ اللہ ان لوگوں کے خیال کے مطابق خود خدا بھی داخل نہیں ہوتا ——— اُس کے لیے لازم تھا کہ وہ حکومت کا غدار اور اس کے خلاف سازش کرنے والا بنے۔ اور اگر وہ سازشی نہیں بننا چاہتا تو پھر اسے تحقیق و تفتیش کے نام پر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا ہوگا، اور خدا ہی جانتا ہے کہ پھر اس تحقیق و تفتیش کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔

مذکورہ بالا افسر نے مجھ سے ایک بات سچی کہی اور دوسری جھوٹی۔ اس کی یہ بات سچی تھی کہ میں تعذیب کا جو انداز دیکھنے والا ہوں وہ قرونِ وسطیٰ کی "تحقیقاتی عدالتوں" کے مظالم سے بھی بڑھ کر ہے۔ فی الواقع میں نے آنے والے سنگین و گراں ایام میں اس بات کا مشاہدہ اور تجربہ کر لیا ——— تعذیب اس قدر شدید کہ اکثر لوگ ہر لمحہ موت کی آرزو کرتے۔ نفسیاتی عذاب ایسا کہ میں نے بارہا لوگوں کو تازیانے کی ایک خفیف ضرب سے دم توڑتے دیکھا۔ ان مناظر نے خود میرے دل و دماغ کو پامال اور جسم و جان کو مضمحل کر کے رکھ دیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ بے گناہ ہیں۔ ان میں سے کچھ وہ لوگ بھی تھے جو بڑے عالی حوصلہ تھے۔ اور بعض تو اس قدر کٹر سے لگے کہ تعذیب و توہین کے باوجود جلادوں کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرتے رہتے حالانکہ

ان کے اور موت کے درمیان صرف چند لمحات کا فاصلہ رہ چکا تھا۔

اُس کی یہ بات جھوٹ تھی کہ " اس جگہ خدا بھی داخل نہیں ہوتا۔ اور اس جگہ کا خدا کو بھی علم نہیں ہے "۔ میں کہتا ہوں کہ خداوند تعالےٰ کی ذات وہاں موجود تھی۔ میں نے خود بارہا خوف و دہشت کے تاریک سائے کے اندر اس ذات بابرکات کا دیدار کیا۔ بلکہ میں کہوں گا کہ اللہ تعالےٰ کی حقیقی معرفت مجھے پہلے حاصل نہ تھی۔ یہ مجھے اس وقت حاصل ہوئی جب مجھے اُس مقام پر لے جایا جاتا رہا تھا جو زندگی کے آخری کنارے پر واقع ہے۔

ابو زعبل کی جیل میں زرعی انجینئر ایم۔ این۔ زیڈ بھی موجود تھے۔ ایک عرصہ سے میری ان سے شناسائی تھی۔ گو تعلقات معمولی اور سطحی تھے۔ یہ میرے دوست م۔ غ کے پاس رہتے تھے۔ جن کے ہاں میں کبھی کبھار آتا جاتا رہتا تھا۔ یہ سب حضرات زرعی کالج کے گریجویٹ تھے۔ اور ان کا تعلق یحییٰ حسین کے گروپ سے تھا۔ زرعی کالج کا بڑا بدقسمت گروپ! گردشِ احوال نے ان کے درمیان مفارقت پیدا کر دی تھی۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے معاملات میں مصروف ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ میری اور م۔ غ کی سرِ راہ اتفاقیہ طور پر انجینئر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ اُس وقت ہم دونوں محلہ زیتونہ میں شام کو چہل قدمی کر رہے تھے۔ خوب ملاقات رہی۔ محبت و شوق کا تبادلہ ہوا۔ اور دُعا و سلام پر باہم جدا ہوئے۔ اُس ملاقات میں ہمیں معلوم ہوا کہ انجینئر صاحب سوہاج کے صوبے میں صوبائی محکمہ زراعت میں ملازمت کر چکے ہیں۔ ان کی بدبختی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے کاغذ کے ایک پرزے پر اپنا نام اور پتہ لکھا۔ اور اپنے دوست م۔ غ کو دے دیا۔

یونہی عرصہ دراز گزر گیا اور پھر ان دونوں کی باہم کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ ہمارے انجینئر ایم۔ این۔ زیڈ صاحب کو سوہاج سے ایسی حالت میں گرفتار کر لیا گیا جب وہ دفتر میں بیٹھے زرعی امور کے بارے میں گوشوارے بنا رہے تھے۔ جیل میں انہیں جب لایا گیا تو ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ ابو زعبل میں اُن سے اخوان المسلمون کی خفیہ تنظیم کے بارے میں اُسی طرح پوچھ گچھ کی گئی جس طرح منکر نکیر کسی کافر سے کرتے ہیں۔ اس بیچارے کو بڑا ہی سنگین اور خوفناک عذاب دیا گیا۔ وہ اس بات سے قطعاً بے خبر تھا کہ اُسے کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ وہ جیل میں برہنہ رینگ رہے تھے۔ اُن کے دونوں ہاتھ زنجیر میں بندھے ہوئے تھے۔ اور وہ شدت درد سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔

تعذیب و تشدد کے نتیجے میں آخر کار انجینئر صاحب نے تسلیم کر لیا کہ وہ اخوان کی خفیہ تنظیم کے رکن ہیں۔ پھر انہوں نے پوری کوشش کی کہ اپنے بیانات کو وزنی اور مؤثر بنائیں مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ وہ ایسی کسی تنظیم کو اصلاً جانتے ہی نہ تھے۔ اور نہ ان کا علمی اُفق ایسے معاملات کا احاطہ کرنے کی گنجائش رکھتا تھا۔ یہ بھلا مانس انسان اعصابی لحاظ سے بالکل تباہ ہو گیا۔ گرفتاری کے تمام عرصہ میں وہ اعصابی حملوں کا شکار رہا۔ اور تین سال کے بعد اسے جب رہا کیا گیا تو وہ ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی ہر لحاظ سے ناکارہ ہو چکا تھا۔

۱۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات میں نے جاگ کر گزاری۔ تمام شب میں "اوکھلی" میں سلاخوں پر لٹکا رہا۔ صبح ہوئی تو مجھے جیل کے قریب ایک بنگلہ میں لے جایا گیا۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بنگلہ میں "تحقیقات" کا ڈرامہ رچایا جاتا تھا۔ یہ پورا دن شدید گرمی میں گزرا۔ اور میری حالت بھی بہت غیر ہو رہی تھی کیونکہ اس روز مجھے اس قدر مارا گیا کہ پچھلی تمام تعذیب اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔

میجر ف۔ ع کچھ نئی خود ساختہ اور خیالی معلومات حاصل کرنے کے لیے دن بھر مجھے گیند کی طرح تعذیب کے بیلنے میں بیلتا رہا۔ میں بار بار اسے یقین دلاتا رہا کہ جو کچھ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس کے علاوہ میرے پاس کوئی بات کہنے کے لیے نہیں ہے۔ میں خفیہ تنظیم کا رکن نہیں ہوں، تنظیم کے دوسرے افراد سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ نیز ان افراد کے ساتھ میری راہ و رسم نہایت سطحی تھی اور کبھی انہوں نے مجھے اپنے اندر شامل کرنے کا نہیں سوچا۔ ان افراد سے آپ خود پوچھ سکتے ہیں۔

میجر کہنے لگا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ حزب التحریر الاسلامی کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟

راقم: یہ کیا بلا ہے۔ میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

میجر: لیکن تمہارے گھر سے جو کتابیں برآمد کی گئی ہیں، ان میں حزب التحریر کا لٹریچر ہے۔

راقم: یہ کتابیں قاہرہ کے مکتبوں میں بک رہی ہیں۔ آپ کسی بھی سپاہی کو بھیجیں وہ ایسی سینکڑوں کتابیں خرید کر لا دے سکتا ہے۔

میجر: ان کتابوں کے ساتھ تمہاری دلچسپی کا راز کیا ہے؟

راقم: معلومات عامہ حاصل کرنے کا ذوق۔ انسان کو جانتے رہنا چاہیے کہ اس کے اردگرد کیا کچھ ہو رہا ہے۔

میجر: ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ٹیپ کے بند تک ہم پہنچ گئے ہیں۔ آپ یقیناً اخوان کی تنظیم کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں۔

راقم: لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ کس بنا پر مجھے یہ معلومات حاصل ہوں گی۔

میجر: آپ ہی کہہ رہے ہیں کہ انسان کو ارد گرد کی دنیا سے باخبر رہنا چاہیے۔ آپ کی دلچسپیوں کا دائرہ بھی اسلامی طرز کا ہے۔ اور اخوان کی تنظیم بھی اس دائرے میں آتی ہے۔

راقم: جناب! جس تنظیم کی آپ بات کر رہے ہیں وہ خفیہ ہے یا علانیہ؟

میجر: اے ابن کلب! وہ خفیہ تنظیم ہے۔

راقم: تو پھر میں اس سے کیسے باخبر ہو سکتا ہوں۔

میجر: (نتھنے پھلائے ہوئے) اے ابن الکلب! سب نے یہ کہا ہے کہ تم پانچ رکنی کمیٹی کے اندر شامل ہو۔

راقم: اے وائے روز سیاہ! ایک دم پانچ رکنی کمیٹی میں شامل کر دیا؟ یہ غلط اور غیر معقول بات ہے پانچ رکنی کمیٹی سے پوچھ لیا جائے۔

میجر: پانچ رکنی کمیٹی سے پوچھنے پر اگر یہ واضح ہو گیا کہ یہ بات درست ہے تو؟

راقم: تو پھر تمہارے لیے جائز ہو گا کہ مجھے گولی مار دو۔

میجر: اس صورت میں تمہیں جوتے مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔

بار بار اسی طرز کی گفتگو ہوتی رہی۔ موضوع یہی تھا۔ بلکہ الفاظ بھی قریب قریب یہی تھے۔ عصر کے وقت مجھے دوبارہ ف۔ع کے سامنے حاضر کیا گیا۔ اور اس نے کسی تمہید کے بغیر مندرجہ ذیل سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

میجر: کیا تم خانقاہ والے شعبان کو جانتے ہو؟

راقم: یہ شعبان کا کیا قصہ ہے؟

میجر: اے ابن الکلب! میں جب پوچھا کروں جواب دیا کرو۔ جانتے ہو کتنے گھونسے لگیں گے اور دیکھ رہے ہو کہ کتنی تعداد میں تازیانے میرے پاس پڑے ہیں۔

راقم: حاضر جناب۔

میجر: آؤ بتاؤ۔ خانگاہ والے شعبان کو جانتے ہو؟

راقم: میں اس لقب کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔ میرے ملنے والوں میں شعبان نامی کوئی شخص نہیں ہے۔ اور نہ کبھی آج تک میرے علم میں کوئی ایسا شخص آیا ہے جس کا نام شعبان ہو۔ میں یہ بیان لکھ کر دینے کے لیے تیار رہوں۔

میجر: خوب سوچ لو۔

راقم: حضور بہت سوچا گیا۔ اور میں پوری خود اعتمادی کے ساتھ یہ بیان دے رہا ہوں۔ میں ہرگز ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا جس کا نام شعبان ہو، خانگاہ کا رہنے والا ہو، یا کسی اور شہر کا۔

میجر: تم پر بہت بھاری مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔

راقم: کیا موجودہ مصیبت سے بھی زیادہ بھاری مصیبت کوئی ہو سکتی ہے؟

میجر: تم عنقریب جان لوگے کہ موجودہ مصیبت سے بھی زیادہ کوئی مصیبت بھاری ہے یا نہیں۔

راقم: خدائے بزرگ و برتر کی قسم، میں شعبان نامی کسی شخص کو نہیں جانتا۔

میجر: جھوٹ و بے لاف گزاف نہ اپنے آپ کو تیار کرو۔ تمہیں آج رات فوجی جیل بھیجا جائے گا۔

اگر مجھے کوئی شخص گولی مار دیتا تو وہ مجھے محسوس نہ ہوتی۔ مگر فوجی جیل کا نام سن کر میرا دل دھک سے بیٹھ گیا اور میں یکلخت خوف اور بے تابی میں مبتلا ہوگیا۔ ان دنوں ہم فوجی جیل کے قصے کہانیاں سنا کرتے تھے۔ جس عذاب سے ہم گزر رہے تھے اس سب کے باوجود ہم سمجھتے تھے کہ فوجی جیل کے عذاب سے سخت تر کوئی عذاب ماسوائے عذاب آخرت کے نہیں ہے۔ میرے ذہن میں لحظہ بھر بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ میں فوجی جیل بھی جا سکتا ہوں۔ میں نے یہ سوچ کر دل کو تھاما کہ میجر کی یہ بات دھمکی سے زیادہ نہیں ہے۔ وہاں جانا بہت دُور کی بات ہے۔ ہم کہاں اور فوجی جیل کہاں۔ یوں کچھ دیر کے لیے میرا دل قدرے مطمئن ہوا۔

لیفٹیننٹ عصام المشوکی میرے قریب ہوا۔ اس نے میری آنکھوں سے پٹی اتاری اور مجھے کہا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے جیل کے اندر آؤں تاکہ میں اپنا ضروری سامان لے لوں اور جیل کا لباس جیل والوں کے سپرد کر دوں۔ میں نے دل میں کہا، یہ بات دھمکی کو زیادہ مؤثر بنانے کا حربہ ہے۔ لہٰذا مجھے بھی خوف زدگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ اس کے غرور کو تسکین ہو جائے۔ ہم جیل کی طرف چل دیے۔ پہلی بار میں ان راہوں پر کھلی آنکھوں سے چلا۔ مجھے نوکدار پتھروں کے وہ ڈھیر نظر آئے جن سے میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔ اور بے تحاشا کانٹے بھی بکھرے پڑے تھے جن سے اس راستے میں بار بار آمد و رفت کی وجہ سے میرے پاؤں زخمی ہوتے

اور آبلہ پائی تک نوبت پہنچی۔ جیل کی دیواروں پر مسلح پہرہ دار کھڑے تھے اور وہ یوں غیظ آلود نظروں سے تکتے تھے جیسے شیطان ہوں۔

جیل کے گیٹ کے سامنے اسی طرح کی ایک بڑی گاڑی کھڑی تھی جو قیدیوں کو ادھر اُدھر لے جانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ویسی ہی گاڑی جس میں ہم قلعہ سے یہاں لائے گئے تھے۔ اُسے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ میں جس بات کو محض دھمکی سمجھتا ہوں کہیں وہ سنجیدہ نہ نکل آئے۔ لیفٹیننٹ عصام الشوکی کہنے لگا ––– اور اُس کی آواز یوں سنائی دے رہی تھی جیسے کسی گہرے کنوئیں سے وہ اُٹھ رہی ہو ––– : تم ابھی فوجی جیل روانہ کر دیے جاؤ گے۔ میں نے کہا: کیوں؟ کہنے لگا: مجھے کیا خبر ہے کہ تمھیں وہاں کیوں طلب کیا جا رہا ہے۔ البتہ یہ گوش گزار کیے دیتا ہوں کہ اگر وہاں جاکر تم نے کچھ اور باتیں بتائیں جو یہاں نہیں کی ہیں تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ ہمیں کام کرنا نہیں آتا۔ اگر ایسی ہی صورت ہوئی تو سمجھ لو کہ تم دوبارہ جب یہاں آؤ گے تو تمھیں قتل کر دینے کے لیے مجھے کسی اور بہانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

یہ سن کر مجھ پر چاروں طرف سے خوف و دہشت کے بھوت ٹوٹ پڑے ––––– معاملہ تو سنجیدہ ہی نکلا، الٰہی مدد فرما! میں جیل میں داخل ہوا۔ رنگ اُڑا ہوا اور عقل و فکر غائب۔ بیٹر صبوری کے پاس بائیس اور افراد بیٹھے تھے جنھیں میرے ساتھ ہی جیل جانا تھا۔ انھیں ایک نظر دیکھنے سے پتہ چل جاتا تھا کہ خوف کے مارے اُن کی حالت کس قدر ابتر ہو رہی ہے۔ اکڑوں بیٹھے ہوئے۔ چہروں کا رنگ پیلا۔ سر نیچے لٹکے ہوئے۔ گرمی کی شدت کے باوجود اکثر لرزہ براندام۔

لیفٹیننٹ عصام نے مجھے ایک میجر کے حوالے کر دیا جو فوجی جیل یا ارضی دوزخ کی جانب ہمارے کارواں کا سالار بننے والا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا: "تمھارا وہ لباس کہاں ہے جو گرفتاری کے وقت تم نے پہن رکھا تھا"؟ "اوپر بیرک کے اندر پڑا ہے۔" "کتے کے بچے! بھاگو اور اسے جلدی لے کر آؤ"۔ میں بیرک میں گیا تو دیکھا کہ پوری بیرک قیدیوں سے پُر ہے۔ اور یوں نظر آرہا ہے کہ بیرک نہیں ہے بس آدمیوں سے لدی ہوئی ہے۔ وہ پُرانے نظر بند جو میرے ساتھ یہاں آئے تھے سب میرے انتظار میں تھے۔ اُن میں سے ایک دوست میری طرف بڑھے اور مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگے: حوصلہ کرو، ہم نے سُنا ہے کہ تم اب فوجی جیل جا رہے ہو۔ موت نشدنی ہے۔ قیامت کی گھڑی یقینی ہے۔ اس روز اللہ تعالیٰ کی ذات قبروں میں سے انسانوں کو اُٹھائے گی اور میزانِ عدل نصب ہوگی جہاں ہر انسان کو

کیسے کا صلہ ملے گا ——— میری زبان پر دعائیں جاری ہوگئیں۔ اور میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر نہ ہوسکا۔ آخر اپنا وہ لباس پہن لیا جس میں گرفتار ہوا تھا۔ جیل کا لباس لپیٹ دیا۔ اور ایک گٹھڑی میں پیالہ، پلیٹ اور المونیم کا چھوٹا سا نیا چمچہ، جنہیں میں نے ہی پہلی مرتبہ استعمال کیا تھا باندھ دیے۔ بیرک کے تمام لوگوں نے مجھے اپنی دعاؤں اور مناجاتوں کے ساتھ اُسی طرح الوداع کیا، جس طرح اُس شخص کو رخصت کیا جاتا ہے جسے موت کی طرف لیجایا جا رہا ہو۔

نچلی منزل پر آیا۔ اور یہ حقیر گٹھڑی جیل کے ملازمین کو واپس کی اور اُن سے اپنی امانت واپس لی۔ یہ امانت کیا تھی؟ تیس مصری قرش۔ گرفتاری کے وقت یہی کچھ میری جیب میں تھا۔ اور یہی تیس قرش میں ایک جیل سے دوسری جیل میں لیے پھرتا رہا۔ اُس وقت مجھے محسوس ہوا کہ یہ جیل مجھے پیاری لگ رہی ہے۔ اس لیے کہ جہاں اب مجھے بھیجا جا رہا ہے وہ مانند دوزخ ہے۔ یہ فارمولا بھی مجھے وہاں ہی سمجھ میں آیا کہ نسبت اشیا کیا ہوتی ہے۔ جس بات نے مجھے بہت زیادہ خوفزدہ کر دیا وہ یہ تھی کہ میں دیکھ رہا تھا کہ خود جلّاد بھی فوجی جیل جانے والوں کو بڑی درد بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ فوجی جیل کا گرز ابوزعبل کے گرز سے زیادہ سخت ہے۔ اور فوجی جیل میں ہم پر جو بلا ٹوٹنے والی ہے وہ اس قدر ہولناک ہے کہ ان کے پتھر جیسے دلوں کے اندر بھی ہمدردی و غمخواری کا مادہ پھوٹ پڑا ہے ——
اے میرے رب کریم کب ہوگی جاں بخشی، تیرا فیصلہ اپنے مقررہ وقت پر ہی صادر ہوگا —— اے دل ناتواں، حوصلہ کر۔ مرشد کہا کرتا تھا ؎

یہ قدم قدم پہ سوادِ کوئے جاناں!
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہے پیاری

(باقی)